ظفر سپل

مسلم فکری دھارے کا بہاؤ

—ایک اجمالی جائزہ—

جس وقت سرزمینِ عرب پر طلوعِ اسلام کا نہایت اہم تاریخی واقعہ ظہور پذیر ہوا ہے تو دو طاقتیں تھیں جو حقیقی معنوں میں اس وقت کی سپر پاور کہلانے کی سزاوار تھیں، ایک تو ایران تھی اور دوسری روم۔ ظاہر ہے یہ دونوں محض فوجی طاقتیں نہیں تھیں بلکہ پُر اثر تمدن تھے جو فکری اور ثقافتی سطح پر باقی دُنیا کو متاثر کرتے تھے۔ ذرا پیچھے جائیں تو پتا چلتا ہے کہ اس وقت سے قریباً بارہ سو سال قبل چار تمدنی مرکز تھے جنہوں نے بے پناہ فکری توانائیوں کا اظہار کیا تھا اور وہ تھے چین، ہندوستان، ایران اور یونان۔ مگر اسلامی فکر کے طاقتور سرچشمے نے جس فکری دھارے کو اپنے اندر سمویا، وہ یونانی فلسفیانہ فکر کا دھارا تھا۔

اور یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ریگِ صحرائے عرب پر مسلم فکر کا خیر سے لدا ہوا بادل برسا اور جہالت کے ریگستانوں کو ایسے گلزار میں بدل گیا، جس سے ایک زمانہ نہیں، آنے والے سارے زمانے مستفید ہوئے--- یہ ہرگز اتفاق نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے اس الٰہیاتی عقیدے کی طاقت تھی جو اسے قرآن و حدیث کی صورت میں غیر مصالحت پسندانہ توحیدی نظریے نے عطا کی تھی۔

مگر اس غیر مصالحت پسندانہ توحیدی نظریے میں ایک سائنسی، ارتقا پذیر اور ترقی پسند عالمگیر رویوں کے سوتے پھوٹتے تھے اور وہ اس طرح کہ یہ نظام اس سوال پر تو کوئی سمجھوتا نہیں

کرتا کہ خدا واحد لاشریک ہے، مگر اس طرح کہ باقی سوالوں پر کوئی قدغن نہیں لگاتا کہ آیا وہ کائنات سے ماورا کوئی ذات ہے یا اسی کے اندر جاری و ساری کوئی طاقت؟ زمان و مکان کے ساتھ اس کے رشتے اور تمام کائناتی اعمال کے صدور سے اس کے تعلق کی نوعیت کی تفصیلات کو انسانی عقل کا میدانِ فکر بنانے پر بھی وہ کوئی اعتراض نہیں کرتا۔

سو یہ سائنسی، ارتقا پذیر اور ترقی پسند عالمگیر رویے رکھنے والی روحِ اسلام قرآن و حدیث سے اپنی قوتِ محرکہ اخذ کرتی تھی۔ قرآن جو کہتا تھا:

''انسان کو جو فضیلتیں عطا ہوئی ہیں، ان میں علم کی فضیلت الٰہی ہے، جس کی بدولت انسان کو فرشتوں سے افضل ہونے اور زمین پر خدا کا نائب بننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ (س، ۳:۱۰)

یا ''جو لوگ علم سے بے بہرہ ہیں وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو علم سے بہرہ ور ہیں۔'' (س، ۳۹:۹)

اور احادیثِ نبوی کی صورت میں کلامِ پیغمبر شہادت دیتا تھا:

''سب سے پہلے عقل پیدا کی گئی اور اللہ نے عقل سے بہتر کوئی شے نہیں پیدا کی۔''

اور

''جو علم کی جستجو میں رہتا ہے، اس کو موت فنا نہیں کر سکتی۔''

یہ محض الفاظ نہیں تھے، جو علم کی اہمیت اور تعریف میں بیان کیے گئے تھے، بلکہ وہ بنیاد تھی جس پر ایک نئے فلسفے، نئے تمدنی نظام، نئے سیاسی نظریے اور نئی حیرت انگیز اور انقلابی اخلاقیات کی عمارت تعمیر ہونا تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب فکر کی روشنی تو بہت دُور کی بات ہے، لندن کی سڑکوں پر رات کے اندھیرے میں کوئی چراغ نہیں جلتا تھا۔ ان کے کسی تمدن کی عمارت کا تو ذکر ہی کیا، ان کے حکمرانوں کے محلات ہنوز جانوروں کے اصطبلوں سے بہتر نہ ہوئے تھے۔

پس یہی وہ منبع تھا، جس نے مسلم فکر و فلسفے کو بال و پَر عطا کیے اور قرآن و حدیث کے

اسی منبع کی روشنی میں مسلم فکر کا غیر متعصب قافلہ منزلیں مارتا ہوا ہر اس علمی سرچشمے سے مستفید ہوا، جس کی قابلِ قدر فکری روایت موجود تھی اور ظاہر ہے کہ اس وقت یہ قابلِ قدر علمی فکری وراثت یونان اور یونانیوں کی مفتوحہ سرزمینوں میں مدفون تھی۔

سکندر یونانی یونان سے اُٹھا اور مشرق میں دور تک مار کرتا چلا گیا مگر وہ چیز جو میرے نزدیک اسے عظیم فاتح سے زیادہ اہم اور تاریخی طور پر قابلِ ذکر بناتی ہے، وہ اس کی مشرق و مغرب میں تمدنی اور علمی ربط کی خواہش ہے۔ اسی پس منظر میں ظہورِ اسلام سے قبل مصر میں اسکندریہ سکول، ایران میں جندیساپور سکول اور عراق میں حرانی سکول کا قیام عمل میں آیا۔ ان تینوں سکولوں نے علومِ طبیعہ کی اشاعت میں گراں قدر خدمات انجام دیں، گو کہ ان کے تمام مباحث میں علمِ نجوم اور علمِ سحر کی آمیزش بھی پائی جاتی تھی۔ اسلامی دور تک یہ تینوں سکول موجود تھے اور یہی سکول مسلمانوں میں فلسفیانہ افکار کی اشاعت کا سبب بنے۔ اس سے پہلے کہ ہم تینوں مدرسوں کے مسلم فکر و فلسفہ پر مرحلہ وار اور تدریجی اثرات کا جائزہ لیں۔ مجھے پس منظر کو ذرا زیادہ واضح کرنے کے لیے یونانی فلسفیوں کے تین فرقوں کا ذکر کرنے دیجیے:

اُن میں ایک فرقہ تو دہریوں کا تھا جن کا نمائندہ شالیس ملطی ہے۔ یہ لوگ سمجھ نہ آنے والی تمام پیچیدگیوں سے صرفِ نظر کرنے کی غرض سے عالم یا مادے کو قدیم اور غیر مخلوق کہتے تھے۔ سو خدا کے وجود کے منکر تھے۔ اسی فرقے نے اس دور میں کیمونسٹ فلسفیانہ نظریے کو ''سائنسی'' جڑیں فراہم کیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ مسلمان اس نظریے کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرا فرقہ حکمائے طبعین کا ہے جو کائنات کو پیدا کرنے والے قادرِ مطلق اور حکیم خدا کے وجود کو تو تسلیم کرتا تھا مگر موجودات کے فنا ہونے کے مشاہدے نے اس کی اس رائے کو پختہ ہونے میں مدد دی کہ انسان بھی چونکہ عناصر سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے طبعی پختگی حاصل کرنے کے بعد فنا ہو جاتا ہے۔ پس انہوں نے حشر و نشر کے فلسفے کو مسترد کر دیا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے یہ فرقہ بھی مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ تیسرا فرقہ حکمائے الٰھین کا ہے۔ جس کے نمائندے سقراط، افلاطون اور ارسطو ہیں۔ اسی فرقے نے پہلے دو فرقوں کے نظریات کی منطقی جانچ پرکھ

کرتے ہوئے ان کے ساتھ مناظرہ کیا اور یہی وہ لوگ تھے جو مسلم فکر پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والے تھے۔

اگر تاریخی طور پر جائزہ لینے کی کوشش کریں، تو لگتا ہے کہ سب سے پہلے اسلامی عرب جندیسا پور سکول سے رابطے میں آیا اور وہ اس طرح کہ حارث بن کلدہ، جس نے جندیسا پور جا کر طب کی تعلیم حاصل کی تھی، عہدِ رسالت میں موجود تھا۔ ایک دفعہ جب حضرت سعد بن ابی وقاص حجۃ الوداع کے موقع پر بیمار ہوئے تو پیغمبرِ خداؐ نے ان کو حارث بن کلدہ سے علاج کا مشورہ دیا۔ حارث چونکہ مسلمان نہیں تھا، اس لیے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ کسی بھی علمی منبع سے مستفید ہونے کی روایت عین دورِ پیغمبر اسلام سے چل نکلی تھی۔ مگر مسلمانوں کی سب سے پہلی علمی آشنائی حضرت عمرؓ کے دور میں فتح اسکندریہ کے بعد اسکندریہ سکول سے ہوئی۔ اسکندریہ کا نامور فلسفی یحییٰ نحوی اس وقت زندہ تھا۔ وہ خود فاتحِ مصر عمرو بن العاصؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے فلسفیانہ خیالات اور منطقی استدلال اس وقت کے مسلمانوں کے لیے ایک عجوبہ سے کم نہ تھے۔ اس لیے اہلِ عرب اس کے گرویدہ ہو گئے۔[۳]

اگرچہ دورِ بنو اُمیہ میں بھی اسی مذہبی علمی بے بغضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت امیر معاویہؓ نے ایک عیسائی طبیب ابن آثال کو اپنا طبیبِ خاص مقرر کیا۔ جس سے وہ پہروں علمی گفتگو بھی کیا کرتے تھے۔ مگر پہلی واضح فلسفیانہ آواز جس سے مسلمانوں کے کان آشنا ہوئے، سکندریہ ہی سے آئی تھی۔ وہی یحییٰ نحوی جس نے عمرو بن العاصؓ سے ملاقات کی تھی، کہا جاتا ہے کہ اس نے خالد بن یزید بن معاویہ کو بھی طب کی تعلیم دی۔ اگرچہ شہرزوری کی روایت کے مطابق وہ حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے تک زندہ رہا۔ اگر یہ روایت درست بھی ہے، تب بھی یہ غلط نہیں ہے کہ فلسفیانہ تعلیم کی ابتدا دورِ بنی اُمیہ میں خالد بن یزید سے ہوئی جو بلاشبہ اسکندریہ سکول سے مستفید ہوا۔ محرومِ خلافت خالد بن یزید کو علمِ طب اور علمِ کیمیا سے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ اس نے عربی جاننے والے ان یونانی فلسفیوں کو جو مصر میں رہتے تھے، اپنے پاس بلایا اور فنِ کیمیا کی یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ یہ اسلامی عہد میں ترجمے کی پہلی مثال ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے اسکندریہ کے ایک اور طبیب اصطفن کا بھی ذکر کیا ہے جس نے خالد بن ولید کے لیے کیمیا کی کتابوں کے ترجمے کیے۔ ڈی بوئر کا خیال ہے کہ ''سب سے پہلے ضرب الامثال، حکیمانہ اقوال، خطوط، وصیت نامے اور عموماً تاریخ فلسفہ کے متعلق کتابیں جمع کی گئیں اور ان کا ترجمہ ہوا۔ لیکن یونانی طب، سائنس اور منطق کی کتابوں کا ترجمہ کہیں منصور کے زمانے میں جا کر ہوا۔''

زیادہ متمدن عباسی دور میں اسکندریہ سکول نے اپنے اثرات کھو دیئے۔ اِس لیے کہ مصر عراق سے نہ صرف دور تھا بلکہ اس کے علمِ سحر اور رہبانیت میں ڈوبے ہوئے فلسفیانہ خیالات زیادہ ترقی یافتہ بغداد کو متاثر کرنے کے اہل نہیں تھے۔ اب جندیساپور اور حرانی سکول کی باری تھی۔ جندیساپور سکول کا اثر خلیفہ منصور سے شروع ہو کر مہدی اور ہارون الرشید کے زمانے تک گیا۔ مامون الرشید، موفق باللہ اور اس کے بیٹے معتضد باللہ کے دور میں حرانی سکول نے کام دکھایا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے مشہور طبیب اور منجم ثابت بن قرہ حرانی (۲۲۱-۲۸۸ھ) کا نام آتا ہے جو حیران میں پیدا ہوا اور بعد میں بغداد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہی ثابت بن قرہ تھا جو باپ کی طرف سے گھر ہی میں قید کیے گئے معتضد باللہ کو بغرضِ دل بستگی روزانہ ملتا تھا اور فلسفیوں کی کہانیاں سناتا تھا۔ ثابت بن قرہ کے بعد اس کے بیٹے سنان بن ثابت اور پوتے ابراہیم بن سنان نے علومِ طبیعہ کے حوالے سے شہرت حاصل کی۔

اب عباسی دور آتا ہے--- یہی وہ دور ہے جب تراجم کی طرف باقاعدہ سنجیدگی سے توجہ دی گئی، مگر یہاں ایک سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں؟ مجھے سچائی سے کہنے دیجیے کہ پہلی وجہ تو بادشاہوں کی طبعی ''ضرورتیں'' ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ طبی ضرورتوں نے انہیں محض اطباء کی ضرورت تک محدود نہیں رکھا۔ وہ علمِ نجوم کی طرف متوجہ ہوئے۔ کیونکہ کوئی شخص اس وقت تک طبیب نہیں بن سکتا تھا جب تک وہ علمِ نجوم کا ماہر نہ ہو، مگر یہ حقیقت انہیں ایک قدم اور آگے لے گئی کہ کوئی منجم فلسفی ہوئے بغیر علمِ نجوم کا ماہر نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسری وجہ گوشۂ گمنامی میں پڑی اقلیدس اور طبیعیات کی ان کتابوں کو دیکھنے اور پڑھنے کا اشتیاق تھا جو قیاصرہِ روم کے کتب

خانوں میں مقفل پڑی تھیں اور جن کو ان کا مذہب یا پادری پڑھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ابنِ خلدون اس طرف پہلے ہی اشارہ کر گیا تھا۔ اب خلیفہ منصور نے ان کے بارے میں اپنے ذمی پادریوں سے سنا تو اُس نے قیصرِ روم سے ان کتابوں کو طلب کیا۔ ایک اور وجہ بھی تھی کہ وہ یہ کہ ایک نومسلم شخص عبداللہ بن مقفع کی نمائندگی میں ایک ایرانی جماعت تھی جو اپنے قدیم عقائد، اخلاق اور تمدن کو مسلمانوں میں رائج کرنے کی خواہش مند تھی، سو منطق اخلاق، تاریخ اور مجوسیوں کے قدیم مذاہب مثلاً مانویت وغیرہ کی کتابوں کے ترجمے فارسی زبان سے عربی میں کیے گئے۔ یہ وہی عبداللہ بن مقفع ہے جو ابتداءً مجوسی تھا اور پہلے عباسی خلیفہ سفاح کے چچا کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ اگرچہ شعائرِ اسلام کی پابندی بھی کرتا تھا لیکن اندر سے زندیق تھا۔ سفاح کا کاتب بھی رہا۔ اسی شہ پر ابتدائی عباسی دور کے اُن عرب امراء پر طنز و تشنیع اور اہانت کے تیر چلا کر دل کا بغض نکالا کرتا تھا جو ابھی اپنے عہدوں پر قائم تھے۔ بصرہ کے گورنر سے ملتے وقت ہمیشہ ایسا فحش فقرہ کستا تھا جس میں اس کی ماں کی عفت پر حملہ ہوتا تھا۔ یہ اہانت ایک عرب اشراف کے لیے ناقابلِ برداشت تھی سو اس نے موقع ملتے ہی اسے ۱۴۲ یا ۱۴۳ھ میں قتل کروا دیا۔

منصور کے عہد میں سب سے پہلے ہیئت کی ایک کتاب سدہانت کا ترجمہ سنسکرت سے عربی میں کیا گیا۔ ان علوم کا ذکر اوپر ہو چکا ہے جو فارسی زبان میں موجود تھے اور جن کا ترجمہ عبداللہ بن مقفع وغیرہ نے عربی میں کیا تھا۔ طب کی کتابیں اس کے علاوہ تھیں۔ منصور کے عہد میں ارسطو کی منطق کی کتابوں کے عربی ترجمے کا ذکر بھی ملتا ہے جنہیں عبداللہ ہی نے کیا تھا۔ عبداللہ بن مقفع کا شاندار کارنامہ علم الاخلاق کی معروف کتاب کلیلہ و دمنہ کا فارسی سے عربی میں ترجمہ ہے۔ کلیلہ و دمنہ کو نوشیرواں کے دور میں ہندوستان سے لا کر سنسکرت سے فارسی میں منتقل کیا گیا۔

منصور کے بیٹے مہدی کے دور میں تراجم کا کام نہیں ہوا۔ دراصل مہدی نے محسوس کیا کہ کتب کی اشاعت نے مسلمانوں میں الحاد کی ایک لہر کو جنم دیا ہے، سو اس نے ملحدوں اور

زندیقوں کے استیصال کے لیے ایک محکمہ بنایا جو ملحدوں کو سزائیں دیتا تھا۔ مگر وہ بھی ایک علمی کام کر گیا اور وہ یوں کہ اُس نے اس فتنہ کا مذہبی اور علمی طور پر خاتمہ کرنے کی خواہش میں علما کو حکم دیا کہ وہ ملحدوں کی تردید میں کتابیں لکھیں۔ سو مہدی کے دور میں علم الکلام کی بنیاد پڑی۔

ہارون الرشید کے دور میں کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا کہ سنبھلنے میں نہ آتا تھا۔ یوحنا بن ماسویہ کی نگرانی میں کاتبوں کی ایک جماعت نے دل جمعی کے ساتھ بیٹھ کر تراجم کرنے شروع کیے۔ ایک اور مشہور مترجم فضل بن نوبخت کا ذکر بھی ملتا ہے جو فارسی زبان سے فلسفہ و حکمت کی کتابوں کا ترجمہ کرتا تھا۔ دوسری طرف برامکہ کی بدولت بہت سے ہندوستانی حکماء ہارون الرشید کے دربار میں آئے اور سنسکرت کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ کہنا چاہیے کہ اسی دور میں فلسفہ نے علم الکلام پر سایہ کیا۔

مامون کے دور میں تراجم کا کام اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ مگر اب ایک نمایاں فرق تھا۔ مامون نے پہلی بار یونانی علوم و فنون پر اپنے پیشروؤں سے کہیں زیادہ توجہ دی۔ کتب کا ذخیرہ تو ہارون کے زمانے ہی میں جمع ہو گیا تھا۔ اسے منظم کر کے باقاعدہ کتب خانے کی شکل دی گئی اور اسے بیت الحکمت کا نام دیا گیا۔ اس کے علاوہ مامون نے خود قیصرِ روم کو خط لکھ کر یونانی علوم و فنون کی قدیم کتب کو منگوایا اور ان کا عربی میں ترجمہ کروایا۔ مامون کے تذکرہ نگار اس کے ایک خواب کا بھی ذکر کرتے ہیں، جس میں اس نے ایک وجیہہ بڈھے کو جو اپنا نام ارسطو بتاتا تھا، منبر پر بیٹھ کر خطبہ دیتے دیکھا۔ مامون کے اسی خواب کو اس کی یونانی فلسفے کی طرف توجہ کی وجہ بتایا جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ بات ایک افسانہ ہو۔ مگر یہ بات دوسری طرح بھی درست ہو سکتی ہے کہ مامون یونانی حکماء اور علوم میں اسی قدر دلچسپی لینے لگا تھا کہ خواب میں بھی اس کو ارسطو نظر آیا۔

مامونی دور نے بہترین مترجم پیدا کیے۔ مثلاً یحییٰ بن ماسویہ کا شاگرد ابوزید حنین بن اسحاق، حنین کا بیٹا اسحاق بن حنین، حنین کا بھتیجا ابن الحسن اور ابوبشر مطا بن یونس وغیرہ۔ حنین بن اسحاق نے کتبِ اقلیدس؛ جالینوس، بقراط اور ارشمیدس کی کتب کے بعض حصص؛ افلاطون کی ری پبلک اور ارسطو کی ''کیٹی گوریز'' کے تراجم کیے۔ اسحاق بن حنین نے افلاطون کی ''سوفسط''،

ارسطو کی ''میٹافزکس'' اور فرفوریوس کی شرحیں لکھیں۔ باپ کو زیادہ شوق طب سے جبکہ بیٹے کو فلسفے سے تھا۔ لیکن جیسا کہ ڈی بوائر نے لکھا ہے: یہ چونکہ سب لوگ مل جل کر کام کرتے تھے، اس لیے بعض کتب ایسی ہیں جو کبھی کسی کی طرف منسوب ہو جاتی تھیں اور کبھی کسی کی طرف۔ ڈی بوائر کا یہ کہنا بھی معقول لگتا ہے کہ ''ان ترجموں کو بہت بڑے فلسفی نہیں سمجھنا چاہیے۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ یہ اپنے شوق سے کام کرتے ہوں۔ زیادہ تر خلیفہ، وزیر یا کسی اور جلیل القدر شخص کے حکم سے انہیں تصنیف و تالیف کی توفیق ہوتی تھی۔ علاوہ اپنے خاص فن کے (جو اکثر فنِ طب ہوتا تھا) ان لوگوں کو حکیمانہ پند و موعظت کی کتابوں سے بہت دلچسپی تھی۔ مثلاً کہانیاں جو اخلاقی نتائج رکھتی ہوں، مفید حکایتیں، ناصحانہ اقوال''۔ موفق باللہ اور اس کے بیٹے معتضد باللہ کے دور میں ہم ثابت بن قرہ کا ذکر پہلے ہی پڑھ چکے ہیں۔ سو اس طرح قیامِ بغداد کے ۸۰ سال کے اندر اندر بیشتر یونانی و دیگر علوم و فنون عربوں کی دسترس میں آ چکے تھے۔ عباسی عہد کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس عہد میں خود خلفاء، وزراء اور امراء تحصیلِ علم و ادب میں مصروف تھے۔ بقول ڈی بوائر منصور، ہارون اور مامون ادبی حیثیت سے کارل اعظم سے فاضل تر تھے اور ایم ایم شریف صاحب نے مئی کے حوالے سے کمال کی بات لکھی ہے:

''یہاں مشرق میں ہارون الرشید اور المامون یونان و فارس کے فلسفے کی چھان بین کر رہے تھے تو وہاں مغرب میں ان کے ہم عصر شارلیمان (فرانس) اور اس کے امراء و عمائدین حروفِ تہجی لکھنا سیکھ رہے تھے۔''

اب اسلامی فکر نے اپنے بنیادی داخلی منبع قرآن و حدیث اور خارجی ماخذ خصوصاً یونان کی فلسفیانہ وراثت کے موتی اپنے دامن میں سمونے کے بعد ان کی اشاعت اور پھیلاؤ کی طرف توجہ دی۔ مسجد کی صورت میں اسلام کے پاس ایک ایسا انقلابی ''سنٹر'' پہلے ہی موجود تھا جو ہر ایک ''سٹریٹ'' کی ضرورت تھا۔ یہ محض ایک روایتی عبادت گاہ نہیں تھی بلکہ مسجد اور اس کے ملحقات لوگوں کی اخلاقی و سیاسی اور خصوصاً علمی تربیت کے فرائض انجام دیتے ہوئے ابتدائی مکاتب کا درجہ اختیار کر گئے تھے۔ ان مکتبوں کا نصابِ تعلیم قرآنی تعلیمات، پیغمبرؐ کی حیاتِ طیبہ

اور آپؐ کے فرامین، منطق اور حساب، اور صرف ونحو کی مبادیات پر مشتمل ہوتا تھا۔ سب سے پہلا باقاعدہ مدرسہ (کالج) المامون نے بغداد میں قائم کیا۔ ۱۰۶۵ء میں سلجوقی بادشاہ الپ ارسلان کے ایرانی وزیر نظام الملک کا قائم کردہ اقامتی مدرسہ ''نظامیہ'' ایک ایسا قابلِ رشک مدرسہ تھا جس کے تنظیمی ڈھانچے کی نقالی بعد میں یورپ کی بعض قدیم جامعات نے کی۔ مدرسہ نظامیہ میں پڑھائی جانے والی دینیاتی تعلیم کا وہی مرتبہ تھا جو بعد میں یورپی جامعات میں ادبیاتِ عالیہ کو دیا گیا۔ شام میں الرشیدیہ، امانیہ، ترخانیہ اور شریفیہ اور مصر میں ناصریہ اور صلاحیہ کے نام سے اسی طرز پر معروف مدرسے قائم کیے گئے۔ جہاں تک ہسپانیہ کا تعلق ہے، اس کے صرف ایک شہر قرطبہ میں کئی سو مدرسے تھے اور یہ ہسپانیہ ہی کی سرزمین تھی جہاں ان اداروں کی بنیاد پڑی جو آجکل یونیورسٹیاں کہلاتے ہیں۔ جامعہ قرطبہ کے داخلی دروازے پر لکھا تھا:

''دُنیا صرف چار چیزوں پر قائم ہے۔ عالموں کا علم، اکابر کا عدل، عابدوں کی عبادت اور بہادروں کی شجاعت۔''

یہ علم اور اس کی اشاعت کی خواہش ہی تھی جو کاغذ کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے عباسی دور میں کاغذ سازی کی صنعت کے قیام پر منتج ہوئی اور ہزار ہا نجی اور پبلک لائبریریاں وجود میں آ گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ صرف ہسپانیہ میں تین پبلک لائبریریاں تھیں۔ دسویں صدی عیسوی میں قرطبہ لائبریری میں تقریباً چار لاکھ کتابیں تھیں۔ اس زمانے میں یورپ کے کسی کتب خانے میں دس ہزار سے زیادہ کتابیں موجود نہیں تھیں۔ کیتھولک انسائیکلوپیڈیا کے مطابق کینٹر بری کا کتب خانہ اپنی اٹھارہ سو کتابوں کے ساتھ مسیحی کتب خانوں میں سرِ فہرست تھا جب کہ ان دنوں قاہرہ کے بیت الحکمۃ میں بیس لاکھ اور طرابلس کے کتب خانے میں تیس لاکھ کتابیں تھیں۔

بے شک عرب حریتِ انسانی کے جوہر سے لیس تھے مگر ان کے یہاں اسلام سے قبل کسی فکری تحریک کی خبر نہیں ملتی۔ قرآن کی صورت میں پیغمبرِ اُمیؐ کا پیش کردہ اسلام اپنے اندر فکری توانائیوں کا سمندر سمیٹے ہوئے تھا۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ آسمانی رہنمائی اور

ہدایت پر مبنی دین یہ سبق لے کر آیا تھا کہ آنے والی نسلوں کو قرآنی اصولوں کے وسیع تر کائناتی دائرے میں رہتے ہوئے، اب اپنے فیصلے خود کرنے ہیں۔ اسی منشور پر عمل کرتے ہوئے مسلمان مفکرین نے وہ کارنامے سرانجام دیئے ہیں، جن سے فکری تاریخ پر کام کرنے والا کوئی عقل کا اندھا بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتا---مسلمان مفکرین کو آسانی سے تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اسلامی الٰہیاتی مفکرین یا متکلمین

۲۔ صوفیاء

۳۔ فلاسفہ

صوفیا پر بات کرنا تو علیحدہ موضوع پر مضمون باندھنے کا متقاضی ہے، یہاں پر ہم صرف متکلمین اور فلاسفہ پر گفتگو کریں گے۔

متکلمین آغازِ اسلام میں سیاسی تنوع فکر یا زیادہ صحیح الفاظ میں سیاسی اختلافات کے نتیجے میں سامنے آئے اور علم الکلام کے منظر نامے پر چھا گئے۔ ان میں سب سے اہم گروہ معتزلہ کا تھا جو یونانی عقلیت پرستی سے شدید متاثر تھے۔ ان کا بنیادی نعرہ عدل تھا اور فلسفیانہ فکر کے حوالے سے ان کا خیال تھا کہ وحی اور عقل دونوں ہی علم کے ماخذ ہیں، سو انہیں ہم آہنگ بھی ہونا چاہیے اور اگر ان میں کوئی تناقص و تضاد پایا جائے تو ایسی صورت میں وحی کو عقل کے میزان پر پرکھنا چاہیے۔ کائنات کی ابتدا کیونکہ زمان میں ہوئی ہے، اس لیے وہ قدیم نہیں بلکہ حادث ہے۔ اس مکتبۂ فکر کے ممتاز فلاسفہ میں واصل بن عطا، نظام، جاحظ اور اخوان الصفا کا گروہ شامل ہے۔

فوراً ہی عقلی متکلمین کے خلاف ردِ عمل سامنے آیا اور لطف کی بات ہے کہ نمایاں لوگ معتزلہ کے اندر ہی سے اُبھر کر سامنے آئے۔ ان کا سرخیل ابوالحسن الاشعری ہے، جس نے مکتبِ اشاعرہ کی بنیاد رکھی۔ یہ لوگ متکلمانہ فلسفیانہ طریقہ کار محض اس لیے استعمال کرتے تھے تاکہ یونانی عقلیت پسندی کے پرزے خود انہی کے ایجاد کردہ ہتھیاروں سے اڑائیں۔ ان کا بنیادی

دعویٰ تھا کہ وحی، الہام اور وجدان ہی علم کا واحد ماخذ ہیں اور عقل کو وحی کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑیں گے۔ غزالی اگرچہ اسی مکتبِ فکر کے نمائندہ ہیں، مگر انہیں بعد میں آنے والے فلاسفہ میں شامل کرنا زیادہ ضروری ہے۔

اب ہم فلاسفہ کا ذکر کرتے ہیں جو سوائے غزالی کے کسی نہ کسی طور یونانی عقلیت پسندی سے ہی متاثر تھے۔ اُنہوں نے مردہ یونانی دانش کو اس کے مقبرے سے نکال کر اس میں دوبارہ روح پھونکی، اسلامی دانش سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور آخرکار یہ ورثہ یورپ کو منتقل کر دیا۔

ان میں سب سے پہلے الکندی (Al-Kindi) (لاطینی الکندیوس، المتوفی ۸۷۳ء) کا نام آتا ہے، جس نے فکری تاریخ میں سب سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا کہ فلسفیانہ تحقیق کے لیے ریاضیاتی منہاج کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعد میں یورپ نے اسے ڈیکارٹ کے نظریے کے طور پر قبول کیا۔ اسی طرح اس دعویٰ کو بھی طرۂ افتخار کے ساتھ پیش کرنے کا سزاوار الکندی ہے کہ علم تین ذریعوں سے منتقل ہوتا ہے۔ عقل، حواس اور تخیل۔ تخیل سے کُل کا علم حاصل ہوتا ہے، حواس سے جز کا، اور تخیل عقل اور حواس کا واسطہ ملکہ ہے۔ بعد میں کانٹ (المتوفی ۱۸۰۴ء) وہ پہلا مغربی فلسفی ہے جس نے تخیل کو دوسرے دو ملکات یعنی عقل اور ادراک بالحواس کا واسطہ قرار دیا۔

فلسفے کی تاریخ میں ارسطو کو اگر ''معلمِ اوّل'' مانا جاتا ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ الفارابی (Al-Farabi) (لاطینی الفارابیوس، المتوفی ۹۵۰ء) ''معلمِ ثانی'' ہے۔ منطق فارابی کا خاص موضوع ہے۔ فارابی نے کندی کے اُٹھائے ہوئے تمہیدی، منطقی اور مابعد الطبیعیاتی مسائل کو نقطۂ کمال پر پہنچا دیا۔

ابنِ مسکویہ یا ابنِ مسکوہ (Ibn-Miskawaih) (المتوفی: ۱۰۳۰ء) اپنے نظریہ ارتقاء اور نظامِ اخلاق کے لیے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ابنِ مسکویہ کا نظامِ اخلاق یہ کہتا تھا کہ مذہب کا اوّلین فریضہ لوگوں کو بااخلاق بنانا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب مذہب بنی نوع

انسان کو آپس میں محبت کی تربیت دے گا۔ ابنِ مسکویہ درویش کی رہبانہ زندگی کو اپنے اخلاقی میزان پر کوئی وقعت نہیں دیتا۔ یہ ابنِ مسکویہ ہی تھا، جس نے نظریۂ ارتقاء کی اوّلین نقش گری کی۔ نو سو سال بعد ڈارون، جس نے سائنسی بنیادوں پر نظریۂ ارتقاء کو مرتب کیا، مجملاً وہی تھیسس پیش کرتا ہے جس کی تشریح ابنِ مسکویہ بہت پہلے کر چکا تھا۔

شیخ الرئیس بوعلی سینا (Avicenna، المتوفی: ۱۰۳۰ء) نے فلسفۂ مشرق کی تکمیل کر دی۔ اس نے پہلی دفعہ ایسا مربوط نظامِ فکر پیش کیا، جس کے اندر ارسطاطالیسی اور نوافلاطونی اسالیبِ فکر باہم متوافق ہو گئے۔ فلسفی اور طبیب دونوں حیثیتوں سے اس کی شہرت کا ڈنکا صدیوں تک یورپ کے علمی اداروں میں بجتا رہا۔ اٹھارہ جلدوں پر مشتمل اس کی تصنیف ''الشفا''، طبیعیات، مابعد الطبیعیات اور ریاضیات کی قاموس ہے۔

ابنِ سینا کے نزدیک معقولات موضوعی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کانٹ کا یہ خیال کہ معقولات موضوعی ہوتے ہیں اور معروضات کا علم حسّی ادراک اور منطقی فہم کے باہمی امتزاج کا نتیجہ ہوتا ہے، ابنِ سینا کے بیان کردہ خیالات پر تعمیر کردہ نظر آتا ہے۔

اسپائی نوزا کے اس نقطۂ نظر کو کہ ذاتِ باری میں عقل، عاقل اور معقول تینوں عین ہیں، علماء نے یہودی مترجم اور عالم میمون کے واسطے سے ابنِ سینا میں ڈھونڈ نکالا ہے۔

الغزالی (Al-Gazali، المتوفی ۱۱۱۱ء) مسلم فکر کی دُنیا میں نہایت زبردست مقام کے حامل ہیں۔ اگر ان کے صحیح صحیح مقام کا تعین کرنا ہو تو پھر کہا جا سکتا ہے کہ غزالی عقلی متکلمین کے ردِ عمل میں اُبھرنے والے اسنادی متکلمین اور صوفیاء کی درمیانی کڑی ہیں۔ ان کی کتاب ''احیاء العلوم'' کو مشرق و مغرب میں ابھی تک نہایت اہم علمی حوالہ تسلیم کیا جاتا ہے اور یہ بات بغیر کسی مبالغے کے کہی جا سکتی ہے کہ ڈیکارٹ سے لے کر برگساں تک کے تمام فلاسفہ کے خیالات پر غزالی کے افکار کی گہری چھاپ پڑی ہوئی ہے۔ ڈیکارٹ کے خیالات تو بغیر کسی تردّد کے غزالی کے خیالات کا چربہ محسوس ہوتے ہیں۔ غزالی کہتا ہے ''میں ارادہ کرتا ہوں، اس لیے میں ہوں''۔ اب ڈیکارٹ کے نہایت مشہور و مقبول قول کو دیکھیے ''میں سوچتا ہوں، اس لیے مَیں

ہوں۔'' لاک اور ہیوم جیسے تمام تجربین علم کی بنیاد عقلی تصورات کی بجائے تجربے پر رکھتے ہیں مگر غزالی زیادہ وسیع تناظر میں کہتے ہیں کہ صرف حواسی تجربہ ہی علم کی بنیاد نہیں۔ نبی، صوفی اور ولی کا وجدانی تجربہ بھی قابلِ اعتماد علمی سند رکھتا ہے۔

مشرق میں فلسفے پر ایک صوفیانہ رنگ تلاش کیا جا سکتا تھا لیکن جب فلسفہ مغرب میں آیا تو یہاں ہمیں پہلا قابلِ ذکر فلسفی ابنِ باجہ (Avempace، المتوفی ۱۱۳۸ء) نظر آتا ہے اور اس پہلے مغربی مسلم فلسفی ابنِ باجہ نے صوفیانہ رجحان کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کر دی۔ اس نے اعلان کیا کہ صوفی کا حسی مخیلہ صداقت کو آشکار کرنے کی بجائے مخفی کر دیتا ہے۔ اس لیے باوجود اس سرور کے جو اس تجربے کے دوران ملتا ہے، فکرِ محض کو حسی مخیلہ پر ترجیح دینی چاہیے۔

ابنِ باجہ کے بعد آنے والا ابنِ طفیل (Abubacer، المتوفی ۱۱۸۵ء) اپنی ایک فلسفیانہ تمثیل ''حیّ بن یقظان'' کی بدولت بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس تمثیل میں یہ بتایا گیا ہے کہ وحی و روایت کے بغیر بھی انسانی فطرت کا علم اور پھر اس کی وساطت سے خدا کی معرفت حاصل کی جا سکتی ہے۔ عوام الناس کو گرویدہ بنا لینے والی یہ کتاب ایک عرصہ تک مشرق و مغرب میں مقبول رہی۔ اس کے ترجمے روسی، ہسپانوی اور انگریزی میں ہوئے۔ ۱۷۰۸ء میں اس کے انگریزی ترجمے کی اشاعت کے گیارہ سال بعد ڈیفو نے اپنی کتاب ''رابن سن کروسو'' پیش کی، جس پر ''حیّ بن یقظان'' کا اثر تلاش کرنا نہایت معمولی دریافت ہے۔

اندھے مغرب کو فلسفے کی آنکھیں عطا کرنے والا ابنِ رشد (Averroes، المتوفی ۱۱۹۸ء) مسلم فلاسفہ میں آخری اہم فلسفی، بلکہ فلسفے کی دلہن کے ماتھے کا جھومر ہے۔ وہ ارسطو کا سب سے سچا، بڑا اور عظیم المرتبت شارح اور مقلد ہے۔ جن اہم خیالات کی بنا پر ابنِ رشد مبتلائے آزمائش ہوا، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ کتب سماوی کی تمثیلی تعبیر ۲۔ نظریۂ صداقت

ابنِ رشد اس نظریے کا مؤید تھا کہ مذہب صداقت کو تمثیلی پیرائے میں پیش کرتا ہے تاکہ عام آدمی کے لیے قابلِ قبول بن سکے۔ وہ کہتا ہے کہ صحیفۂ آسمانی کی ہر تمثیل عوام کی عقلی

استعداد کے عین مطابق ہوتی ہے مگر فلسفہ صداقتِ مشترک کے اظہار میں مختلف ہے۔ اس لیے جب فلاسفہ صداقت کو اپنے عقلی تصورات کے رنگ میں پیش کرتے ہیں جو دراصل حقیقی رنگ ہے، تو چونکہ یہ عوم الناس کی عقل سے ماوراء ہوتے ہیں، اس لیے وہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ابنِ رشد کا نظریۂ عقول و روح بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے مگر یہ نہایت پیچیدہ و اصطلاحی ہے اور ہمارے موضوع سے لگا نہیں کھاتا۔

اپنے سماجی نظریات میں بھی ابنِ رشد مختلف و منفرد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارے زمانے کی عورتیں محض ذاتی تسکین کے لیے گھروں میں جانوروں اور بچوں کی طرح پالی جاتی ہیں۔ حالانکہ اپنی بعض صفات میں وہ مردوں پر بھی فضیلت رکھتی ہیں۔ افریقہ کے بعض قبائل کی عورتوں کے جنگی رجحان کی وجہ سے وہ فیصلہ کرتا ہے کہ یہ عورتیں حکومت کرنے کے لیے بھی موزوں ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ ابنِ رشد کے بعد مشرق و مغرب میں مسلم فلسفے کا چراغ گُل ہو گیا۔ ابنِ رشد کے بعد ابنِ خلدون کا نام لیا جا سکتا ہے جو فلسفۂ تاریخ کا پہلا نظریہ ساز ہے مگر وہ حقیقی معنوں میں فلسفی نہیں، تاریخ داں ہے۔ اب فلسفے کی وراثت کو دوبارہ غیر مسلم مغرب میں منتقل ہونا تھا اور یہ ان یہودیوں نے ممکن بنایا جو عربی بولنے اور عربی لکھنے کو باعثِ افتخار سمجھتے تھے، عربی لباس پہنتے تھے اور عربی تمدن کو پوری طرح اپنے اوپر اوڑھے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے یہ کسی زندہ تمدن کی موت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بعینہٖ جیسے آج ہم انگریزی بولنے اور انگریزی تمدن کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

ابنِ رشدیت نے بڑی تیزی کے ساتھ مغرب میں مروّجہ اسلوبِ فکر کی حیثیت حاصل کر لی۔ وہ چار سو سال تک یورپ کی اقلیمِ ذہن پر حکومت کرتا رہا اور پھر یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کی بنیادیں بھی اسی کے ہاتھوں رکھی گئیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مغربی فلسفہ کی پُرشکوہ عمارت مسلم فلسفے کی پائیدار بنیادوں پر ہی اُٹھائی گئی تھی۔

ماخذ

[۱] پروفیسر میاں محمد شریف، مقالاتِ شریف، بزمِ اقبال، لاہور۔

[۲] پروفیسر میاں محمد شریف، مسلمانوں کے افکار، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

[۳] ڈی اولیری، فلسفۂ اسلام، ترجمہ احسان احمد، بک ہوم، لاہور۔

[۴] ڈی بوائر، تاریخ فلسفۂ اسلام، ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور۔

[۵] مولانا عبدالسلام ندوی، حکمائے اسلام۔

[۶] محمد لطفی جمعہ، تاریخ فلاسفۂ اسلام، ترجمہ میر ولی الدین۔

[۷] ظفر سپل، مسلم فلسفے کا تاریخی ارتقا، بک ہوم، لاہور۔